

مولانا شفیق الرحمان سنبھلی *

دریا سے اٹھی لیکن ساحل سے نہ ٹکرائی

قرآن پاک میں حضرت آدم و ابلیس کا قصہ کئی جگہ ذکر میں آیا ہے ان میں سے ایک جگہ یہ یوں بیان ہوا ہے کہ ابلیس نے جب آدم کو سجود سے انکار کیا اور بارگاہ الہی میں مردود ہوا تو اللہ تبارک تعالیٰ نے آدم سے فرمایا کہ ”اے آدم یہ (ابلیس) تمہارا اور تمہاری زوجہ کا دشمن ہے۔ پس کہیں ایسا نہ ہو کہ یہ (اپنی فریب کاری سے) تمہیں جنت سے نکلوائے اور تم مصیبت میں جا پڑو۔“

پھر آگے آتا ہے کہ اس کھلی تنبیہ اور آگاہی کے باوجود اور اسکے باوجود کہ اس کا حاسدانہ رویہ حضرت آدم اپنی آنکھوں سے دیکھ چکے تھے ابلیس نے جو ایک دوسوے کا جال پھینکا تو حضرت آدم اس کے پھندے میں آ گئے۔ ابلیس کا وہ داؤ کیا تھا اور حضرت آدم نے کیا رد عمل دکھایا؟ قرآن پاک اسے ان الفاظ میں بیان کرتا ہے:

فَقَالَ يَا اٰدَمُ هَلْ اٰتٰكَ عَلٰى شَجَرَةِ الْخُلْدِ وَمَلِکَ لَایٰبِلٰی فَاٰکَلَا مِنْهَا

(ابلیس نے کہا کہ اے آدم کیا میں نے تجھے زندگی کے درخت اور ایسی بادشاہی کا پتہ دوں جو لا زوال

ہے؟ پس ان دونوں (آدم و حوا) نے اس درخت میں سے (پھل کھالیا)

اور یہ وہی درخت تھا کہ جسکے بارے میں حضرت آدم کو آگاہی دی جا چکی تھی کہ اس کے پاس موت جانا۔

حضرت آدم کے ساتھ جب یہ واقعہ پیش آیا تو اس وقت وہ پہلے انسان تھے اور زندگی کے ساتھ موت لازم ہونے کے تجربے سے نا آشنا۔ آج اگر کوئی کسی کو بادی زندگی کا خواب دکھائے تو سلامتی ہوش و حواس کے ساتھ کوئی ابھی اس جال میں پھنسنے والا نہ ملے گا۔ لیکن بادشاہی کے خواب میں گرفتار ہو کر موت سے مل سکتے ہیں اس لئے کہ یہ وہ پرکشش شئی ہے جس کی دستیابی ناممکن نہیں اور اس میں کشش کی جو اصل چیز ہے وہ آزادی و خود مختاری بلکہ حضرت آدم کے لئے تو لفظ ملک اور بادشاہی کا مفہوم اس سے زیادہ کچھ ہو بھی نہیں سکتا تھا۔ جس طرح وہ موت سے نا آشنا تھے اسی طرح بادشاہی انہوں نے اس وقت کہاں دیکھ لی تھی؟ البتہ آزادی و خود مختاری وہ شئی ہے جس کی لپک ہر انسان کیا ہر جاندار کی فطرت میں پائی جاتی ہے۔ ہماری اردو کی ابتدائی تعلیم کے زمانے میں مولانا اسماعیل میرٹھی کی کتابیں پڑھائی جاتی تھیں ان میں سے ایک سبق اسی فطرت کے بیان کا ایک شعر آج بھی یاد آ جاتا ہے۔

ملے خشک روٹی جو آزاد ہو کر

وہ ہے خوف و ذلت کے حلوے سے بہتر

مبالغہ نہ ہوگا اگر کہا جائے کہ یہ جنت جس کی بشارت اہل ایمان کو دی جاتی ہے یہ دراصل انسان کے اپنی اسی محبوب شئی 'آزادی و خود مختاری' سے اللہ تبارک و تعالیٰ کے حق میں دستبردار ہونے اور اس کے احکام کو اپنی خواہشات پر ترجیح دینے کا صلہ ہے۔ آزادی و خود مختاری کا جذبہ فطرت کی بڑی قیمتی متاع بلکہ آدمیت کا جو ہر ہے لیکن جیسا کہ حضرت آدم کے قصے میں دیکھا گیا یہی جذبہ آدمی کے لئے غارت گر بھی بن سکتا ہے۔ بالکل وہی بات جو ہمارے ایک بڑے شاعر نے دل کے بارے میں کہی ہے۔

کامل رہبر قاتل رہزن

دل سا دوست نہ دل سا دشمن

یہ قصہ آدم و ابلیس مسلم خواتین کے ایک مذاکرہ کی روداد پڑھ کر یاد آ گیا ہے۔ یہ مذاکرہ "آج کے دور میں مسلم خاتون کا کردار" کے موضوع پر روزنامہ جنگ کے زیر اہتمام منعقد ہوا تھا اور روزنامے نے اپنی ۱۳ فروری کی اشاعت میں اس کی مکمل روداد چھاپی۔ اس طرح کے مذاکرے آج کل ہوتے ہی رہتے اور چھپتے رہتے ہیں لیکن یہ مذاکرہ اپنی دو باتوں کی وجہ سے لائق التفات بنا۔ (۱) مذاکرے کی مہمان خصوصی جو نیویارک میں ایک کالج کی شعبہ سیاسیات کی سربراہ ہیں ان کا رنج و ملال کہ وہ اپنے طبقے کی ہم وطن خواتین کو مغرب زدگی کی کس انتہاء پر پہنچا ہوا پارہی ہیں! اور (۲) وہ انتہاء جس کے دین نے امریکہ کے ایک کالج میں پڑھانے والی خاتون کو بھی دہلا دیا ان دونوں باتوں کے لئے ذیل کا اقتباس پڑھئے:

"اب میں پاکستانی معاشرے کی خواتین کے بارے میں کچھ بات کروں گی" میں نے

پاکستان میں ۳۳ برس گزارے ہیں اور میں ایک عرصے کے بعد پاکستان سے آئی ہوں۔ کسی پرکتہ چینی

نہیں کرنی چاہیے۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ یہاں کی خواتین اپنی اقدار کو بھول بیٹھی ہیں۔ جب میں

یہاں سے گئی تھی تو مجھے یاد نہیں کہ یہاں کی خواتین کھلے عام شراب پیتی تھیں، دو سال قبل مجھے پوسٹ

ڈاکٹر فیوشپ ملی تھی اور میں اسلام آباد آئی تھی وہاں مجھے ایک پارٹی میں بلایا گیا، اور اس تقریب میں

اسی فیصد خواتین شراب پی رہی تھیں وہ نہ شراب پی رہی تھیں بلکہ مجھ سے اصرار کر رہی تھیں کہ آپ بھی

پئیں کیونکہ آپ تو باہر رہتی ہیں۔ میں نے کہا جب میں باہر رہ کر نہیں پیتی تو یہاں آ کر کیوں پیوں گی۔

ان کا کہنا تھا کہ ہمیں آپ انگریزی بولتی ہیں، چھوٹے ہال ہیں، مغرب میں رہتی ہیں تو پھر آپ ہماری

جیسی کیوں نہیں ہیں؟"

ہماری خواتین میں انقلاب حال کا یہ المیہ جس کی ایک جھلک اس اقتباس میں نظر آئی، اسی جذبہ آزادی و خود مختاری کی غارت گری ہے جس کا تار قلب آدم میں چھیڑ کر ابلیس نے ایک خود فراموشی کے عالم میں آپ کو پہنچا دیا تھا۔ فطرت انسانی میں یہ آزادی و خود مختاری کی لپک کا عنصر یوں تو ہمیشہ ہی انسان کو راہ سے بے راہ کر دینے کی طاقت کا مظاہر کرتا رہا ہے لیکن دنیا پر مغرب کے غلبہ کے بعد سے اس کو جو طاقت میسر آئی ہے تو سچ یہ ہے کہ انسان کو انسان رہنا مشکل ہو گیا ہے۔ مغرب جب دنیا کی بادشاہی کے تخت پر بیٹھا تو کتنے ہی لوگوں کو اسی وقت سے انسان حلیہ دین ملو کھم، کی کہادت کے مطابق اہل مغرب کی زندگی کے کچھ طور طریقے بھانے لگے۔ پھر آگے چل کر جب وہ اپنی علمی برتری کا سکہ جمانے میں بھی اس حد تک کامیاب ہو گیا کہ صرف اس کے جاری کردہ نظام تعلیم سے نکل کر آنے والے ”تعلیم یافتہ“ کہلائے جانے لگے تو اب مغربی زندگی کے طور طریقے صرف ایک حاکم قوم کے طور طریقے نہ رہے بلکہ اب وہ پڑھ لکھوں اور اہل تہذیب و تمدن کے طور طریقے بن گئے جن کا اپنا تہذیبی اور تمدنی ترقی کے ہم معنی ہوا۔ اس طرح مغربیت کے چلن کا حلقہ وسیع سے وسیع تر ہوا اور ہماری اپنی معاشرتی قدریں بے قدری کا شکار۔ مغرب کی بیرونی اور اپنی قدروں کا تحفظ یہ دو چیزیں جمع نہیں ہو سکتیں۔ اس لئے کہ مغرب میں سب سے بالاتر قدر ذاتی زندگی میں فرد کی مکمل آزادی و خود مختاری ہے اور اس بے مہار آزادی کے ساتھ ”قدروں“ کا لفظ کوئی معنی نہیں رکھتا۔

الغرض اس طرح ہماری مشرقی اور اسلامی قدروں سے ٹکرانے والے مغربی زندگی کے چلن ہمارے یہاں مردوں اور عورتوں بھی میں راہ پا گئے۔ لیکن اگر عورتوں میں اس کا تناسب کم بھی رہا، جب بھی ہمارے لئے وہ نقہ ان وہ زیادہ ہوا اس لئے کہ نسلوں کے بناؤ بگاڑ کا زیادہ تر انحصار ماؤں ہی پر ہوتا ہے۔ انہیں کے رنگ ڈھنگ سے اولاد کا بنیادی سانچہ بنتا ہے۔ اور اب تک جتنا نقصان اس سے ہو رہا تھا وہ تو ہو رہا تھا لیکن ادھر اب چند سال سے اس کے نقصان کا پیمانہ وہ ہو گیا ہے کہ اسلامی دنیا اس کا تحمل نہیں کر سکتی ہے۔ اس کا قصہ یہ ہے کہ مغرب اور خاص کر اس کا سربراہ امریکہ موجودہ بین الاقوامی صورت حال سے فائدہ اٹھا کر جس میں اس سے سوال جواب تک کرنے والا کوئی نہیں رہا ہے اقوام متحدہ کے عالمی ادارے کو جس طرح اپنے مقاصد کے لئے استعمال کرنے میں لگ گیا ہے اسی ضمن میں حقوق انسانی کے تحفظ کی وہ تحریک بھی اس کے ایجنڈے میں سرفہرست آ گئی ہے جو اپنی اصل میں بے شک انسانیت دوست ہے مگر امریکہ اور اس کے مغربی خاندان نے اسے اپنے مفادات اور مقاصد کا آلہ کار بنالیا ہے۔ اس میں بھی خاص طور سے ان حقوق کی جو خواتین سے متعلق ہے اور اس پر سب سے ہی زیادہ زور ہے اور اس کی بناء پر ہمارے معاشرے کی یہ صورت حال کہ خواتین میں بھی ایک بڑی تعداد مغربیت پسند ہو گئی ہے ہمارے ملکوں کی آزادی اور خود مختاری تک لئے خطرہ بن گئی ہے۔ ان کے حقوق کے تحفظ کے نام پر مغرب بحوالہ اقوام متحدہ ہمارے ملکوں کی آزادی و خود مختاری تک کو پامال کر سکتا ہے۔ اور اس کا تارہ بہ تارہ پائل کس ساٹے کا بیوت افغانستان کا المیہ ہے۔

افغانستان میں جو کچھ ہوا ہے اس کے تعلق سے یہ بات بھلائی نہیں جاسکتی کہ اس ایسے کی زمین ہموار کرنے میں افغانستان کی ان خواتین کا بڑا دخل ہے جن کے دل و دماغ میں آزادی نسواں کے مغربی تصور نے گھر بنالیا تھا۔ طالبان کی حکومت کو نشانے پر رکھنے کے بعد سب سے پہلے جس ہتھیار کا استعمال اس کے خلاف شروع کیا گیا وہ عورتوں کے سلسلے میں ان کی پالیسی کے خلاف پروپیگنڈہ کا ہتھیار تھا۔ اس کے ذریعے ساری دنیا میں ان کے خلاف یہ فضا بنادی گئی کہ ان لوگوں نے افغانی خواتین کی زندگی عذاب کر دی ہے۔ اور اس پروپیگنڈہ کو اس قدر کامیابی ہرگز نہیں مل سکتی تھی اگر خود افغانی خواتین اس کی ہموائی کے لئے دستیاب نہ ہوتیں افغانی خواتین میں آزادی نسواں کی مغربی تحریک مقبولیت کے جس درجے پر پہنچی ہوئی تھی اس کا ایک بہت مستند اندازہ مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کے ایک سفرنامہ افغانستان کے چنداقتباسات سے کیا جاسکتا ہے۔ یہ سفر مولانا نے ۱۹۷۳ء میں رابطہ عالم اسلامی کے ایک وفد کے سربراہ کی حیثیت سے کیا تھا یہ ظاہر شاہ کا زمانہ تھا مگر بالکل آخری وقت (مولانا کا سفر تمام ہونے کے چند ہی ہفتے بعد ان کا دور بھی اختتام کو پہنچا) مولانا اس سفر میں اپنے رفقاء کے ساتھ افغانستان کے ایک اہم گرلس کالج دیکھنے کا تذکرہ فرماتے ہوئے لکھتے ہیں۔

”ہم نے ملائی گرلس کالج“ بھی دیکھا جو تحریک آزادی کی قائد ایک افغانی خاتون.....

ملائی..... کی طرف منسوب ہے استاذ احمد محمد جمال نے یہیں ایک موزوں اور مناسب تقریر کی جس میں انہوں نے شریعت اسلامیہ میں مسلمان عورت کی حیثیت اور مسلم معاشرہ میں اس کے حقوق اس کی اہمیت اور قدر و منزلت پر روشنی ڈالی اس کالج میں ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے ہم یورپ کے کسی گرلس کالج یا مغربی ممالک کے کسی زنانہ ثقافتی مرکز میں پہنچ گئے ہیں۔ اس جلسے میں احتیاط اور ذہانت کے ساتھ مقرر سے متعدد سوالات بھی کئے گئے استاذ احمد محمد جمال نے قابلیت اور سلیقہ کے ساتھ ان کے جوابات دیئے۔ کالج کی پرنسپل نے مطالبہ کیا کہ تعداد از دواج کی حرمت کا متفقہ فتویٰ صادر کیا جائے۔ کیونکہ اس میں عورت کی سخت توہین ہوتی ہے۔ مقرر موصوف نے اس کے جواب میں وہ اسباب و مصالح بتائے جن کی وجہ سے اسلام نے یہ حق باقی رکھا ہے۔“

افغانی خواتین کے ساتھ نشست کا تذکرہ فرماتے ہوئے لکھتے ہیں:

”ایک نشست ممتاز معزز اور دیندار گھروں سے تعلق رکھنے والی مسلم خواتین کی تھی مجلس

میں شریک ہونے والی خواتین اللہ کا شکر ہے اسلامی عقائد سے باغی یا جدید تہذیب و تمدن کے زعم میں دین سے یکسر بیگانہ و بیزار نہیں تھیں“ پھر بھی ہم یہ محسوس کئے بغیر نہ رہ سکے کہ ملک میں مغربی تہذیب بہت آگے جا چکی ہے اور اس کے سیرات بھی ظاہر ہو رہے ہیں۔ امیر امان اللہ خان کے دورِ تہذیب افغانی

قوم اسلامی افغانی روایات پر بڑی مضبوطی سے قائم تھی..... لیکن اس وقت صورت حال بالکل مختلف ہے۔ افغانی قوم اپنے ماضی سے بہت دور جا پڑی ہے اور یہ دوری ماہ و سال کی تعداد کے اعتبار سے تو بہت کم ہے لیکن فکری اور تمدنی اعتبار سے یہ مسافت بہت طویل ہے، اکثر قومیں کہیں کہیں صدیوں میں اتنی مسافت طے کرتی ہیں، پردہ اب پسماندگی، جہالت اور غربت کی علامت بن گیا ہے۔ اسی وجہ سے دیہاتوں، گاؤں میں بعض دیندار علماء اور دارالسلطنت سے دور کسانوں کے گھروں تک محدود ہو کر رہ گیا ہے، فزنگی لباس عام ہے۔ پھر بھی قدیم ماحول اور طبیعتوں میں رچی ہوئی اسلامی خصوصیات کے اثرات اب تک ان تعلیم یافتہ مسلم خواتین میں کسی نہ کسی درجے میں موجود ہیں، اس لئے ان کے سوالات اور گفتگو میں تو بین و استہزاکا انداز نہیں تھا، بلکہ ہم لوگوں سے دوران گفتگو وہ خاصی قنطاریں ان کی باتوں سے دین اور اہل دین کا احترام جھلکتا تھا..... لیکن ان کے سوالات سے صاف ظاہر ہوتا تھا کہ غیروں کی تہذیب و تمدن کے اثرات کہاں تک پہنچ چکے ہیں، اور مستشرقین کی تحریروں اور اسلام کے اصول و مبادی اور اسلامی نظام حیات کے خلاف ان کا منظم اور منصوبہ بند پروپیگنڈا اور یورپ کے پھیلائے ہوئے کامل مساوات مرد و زن کے نظریہ کے اثرات کتنی گہرائی تک اتر چکے ہیں..... دین کے نمائندہ علماء اور جدید تعلیم یافتہ طبقہ کے درمیان پیدا ہونے والی خلیج بہت وسیع ہو گئی ہے جس کو پر کرنا آسان نہیں ہے۔“

مولانا بڑی نروم قنطاری زبان کے عادی ہیں، ”انہیں ٹھیس نہ لگ جائے آئینوں کو“ یہ ان کا مذاق و مزاج ہے۔ لیکن اس مذاق قنطاری میں ڈوبی ہوئی یہ عبارتیں بھی کیا کچھ نہیں کہے دے رہی ہیں؟ یہ تقریباً ۳۰ برس پہلے کی داستان ہے جو بتا رہی ہے کہ افغانی خواتین یورپ کے نظریہ مساوات مرد و زن کو قبول کر لینے کی راہ پر آج سے اتنے دن پہلے ہی کہاں تک جا چکی تھیں۔

مولانا کا یہ سفر نامہ جس کا عنوان ہے ”دریائے کابل سے دریائے یرموک تک“ مجھے اس کے پڑھ لینے کا موقع اس کے چھپنے کے ساتھ ہی، یعنی کم از کم ۲۵ برس پہلے مل گیا تھا۔ یہ دریائے کابل سے شروع ہو کر دریائے یرموک تک پڑنے والے پانچ مسلم ملکوں کا سفر نامہ ہے مجھے اس پورا سفر نامے میں کوئی بات اگر آج تک یاد رہی تو وہ سفر نامے کا صرف یہی حصہ ہے جس کو یاد پر نقل کیا گیا۔ اور یہ اسلئے یاد رہ گیا کہ اس کو پڑھتے ہوئے دل و دماغ کو جو جھکا لگا تھا وہ بھول جانے والا نہ تھا اور اسی گہری یاد کا نتیجہ تھا کہ ہمارے نیک دل طالبان نے جب اس سرزمین کا اقتدار سنبھالنے پر خواتین کو درون خانہ ہو جانے کا بائند کیا، تو ان کی ہمت مردانہ کو تو داد دینا بڑی مگر ساتھ ہی دل ڈرا کہ دیکھئے مغربی تہذیب کو یہ چیلنج جس کو خود اپنی آبادی کا ایک بڑا اور ذی اثر حصہ خود اپنے سین سے سج کے طور پر لے گا، کیا سامنے لاتا ہے؟

کیا یہ خواتین چین سے بیٹھ جائیں گی جنہوں نے اب سے تیس برس پیشتر کے زمانے میں رابطہ عالم اسلامی کے ایک ایسا موقر وفد سے جس کی سربراہی حضرت سید احمد شہید کے خانوادے کے مولانا سید ابوالحسن علی جیسے ایک رکن فرما رہے ہوں مطالبہ کر دیا تھا کہ تعداد دو اج کو حرام کئے جانا کافوتی دلوائیے؟ خاص کر جبکہ یہ خواتین پورا یقین بھی رکھ سکتی ہوں کہ مغرب اپنے تمام وسائل کے ساتھ ان کی پشت پر آئے گا۔ افسوس ہے کہ یہ ذر غلط ثابت نہ ہوا اور صرف مغرب ہی نہیں ان کو کیل بن کے آگے آیا، بلکہ ساری دنیا جس کو (بشمول مسلم ممالک) اقوام متحدہ کے رزلوشنوں کے ذریعے خواہی غواہی عورتوں کے لئے ان حقوق کی فہرست کا پابند کر دیا گیا ہے جن کو مغرب عورتوں کے لئے واجبی حقوق قرار دیتا ہے، کچھ نہیں تو خاموشی ہی کے انداز میں مغرب کے ساتھ کھڑی پائی گئی۔ الغرض افغانستان پر ان دنوں جو کچھ ہیتی اس میں اس بات کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا ہے کہ اس کے لئے زمین کی ہمواری کا پہلا مرحلہ ان افغانی خواتین ہی کے ہاتھوں مکمل ہوا جن پر مغرب کا افسوس آزادی کا کام کر گیا تھا۔ پس اب یہ ہماری خواتین کی مغربیت کا معاملہ ایک اور زاویے سے بھی دیکھنے جانے کا مستحق ہو گیا ہے اور یہ پہلے سے کہیں زیادہ اہم۔

یہ خیالات خواتینی مذاکرے کی روداد میں سامنے آنے والے اس الم انگیز انکشاف کا نتیجہ تھے کہ ہمارے ایک ملک کی خواتین کے صاحب حیثیت طبقے میں مغرب زدگی اس حد کو پہنچ گئی ہے کہ پارٹیوں میں شراب نوشی کرنے والیوں کا اوسط اتنی فیصد تک ہونے لگا۔ لیکن اس انکشاف کا یہ پہلو کہ یہ اسی ملک کی ایک ایسی خاتون کی زبان سے بعد رنج ہو رہا تھا جو نہ صرف اسی طبقے سے تعلق رکھتی ہے بلکہ مغرب کے سردار امریکہ میں قیام رکھتی ہیں اور ایک کالج میں اپنے شعبہ کی سربراہ ہیں، فوٹو میں انکا سر کھلا اور بال مغربی وضع کے ہیں، پھر بھی انہیں اپنی ہم وطن اور ہم مذہب خواتین کو دھڑلے سے شراب نوشی کرتے دیکھ کر ایسا افسوس ہوا کہ اسی طبقے کی خواتین کے درمیان موقع ملنے پر اپنے رنج و افسوس کا بھرپور اظہار کریں، یہ اس انکشاف کا ایسا خوشگوار پہلو ہے کہ جتنا انکشاف نے مل کر کیا تھا اتنا ہی اسکے اس پہلو نے مسرت بخشی۔ مزید مسرت بات وہاں یہ بھی تھی جو اقتباس میں نہیں آئی ہے۔ محترم خاتون نے اسلام آباد کی جس پارٹی کے حوالے سے اپنا مشاہدہ بیان کیا ہے، اسی کے ذیل میں یہ بھی بتایا ہے کہ ”ان خواتین نے قرآن نہیں پڑھا تھا،“ بیچے نور علی نور۔ مغرب میں رہنے والی کالج میں پڑھانے والی وضع قطع سے فی الجملہ آخذا خیال اور سوچنے کا یہ انداز کہ دیکھوں اپنی ان بہنوں کو قرآن کی بھی کچھ خبر ہے یا نہیں؟ محترمہ کا یہ بیان ہی یہ بتانے کیلئے کافی تھا کہ ماشاء اللہ وہ قرآن پاک سے ایک مسلم خاتون کی طرح وابستگی رکھتی ہیں۔ لیکن اس روداد کے اندر یہ بات لفظوں میں بھی بایں طور موجود ہے کہ ”میں نے قرآن اچھی طرح پڑھا ہے“ اور اسلئے اپنی ان بہن کے حوالے سے اور زیادہ خوش ہونے کی بات۔

مگر محترمہ نے اپنے قرآن اچھی طرح پڑھنے کی بات جس سیاق و سباق میں کہی ہے، اس نے بتایا کہ اتنی نیک دل خاتون کا بھی انداز نظر مغرب کے حکاموں کے سامنے نہ ہو سکا۔ یہ کہ عرب نے کم ہی لوگوں کو چھوڑا ہے

اس موج کے ماتم میں روتی ہے بھنور کی آنکھ
 دریا سے اٹھی لیکن ، ساحل سے نہ ٹکرائی

خاتون بھفل خدا قرآن پڑھتی ہیں، سورہ نساء کی وہ آیت بھی ان کے ذہن میں متحضر ہے جو مرد و عورت (شوہر اور بیوی) کے رشتے میں اس مساوات کے تصور کی قطعی گنجائش نہیں چھوڑتی جو مغرب ہمیں سمجھاتا ہے۔ یہی وہ آیت ہے جس میں ”قواموں“ کا لفظ آیا ہے اور یہ اپنے سیاق و سباق میں کسی ایسا معنی کو قبول کرنے سے قطعی انکاری ہے جس میں مرد کی افضلیت کا تصور قائم نہ رہ سکتا ہو (اگرچہ یہ افضلیت ہرگز اس معنی میں نہیں کہ عورت محکوم ہے تاہم افضلیت کی مطلق نفی اس آیت کے ساتھ ممکن نہیں) اس کے باوجود اگر ہماری ایسی پڑھی لکھی اور متوازن نظر آنے والی خواتین بھی وہی عام لوگوں کی سی بات کرنے لگیں جس سے مغربی تصور مساوات مرد و زن اور قرآن کے موقف میں کوئی فرق سمجھنے کی ضرورت نہ رہے تو اسی موج کا سا المیہ کہا جائے گا کہ جو دریا کی سطح سے اٹھی اور چلی تھی، مگر ساحل سے جانکرانا اسے نصیب نہ ہوا۔ اور اس کی وجہ وہی آزادی و خود مختاری کا لپکا، جس کی بنا پر انسان ہر وقت انوائے شیطانی کا شکار ہو جانے کے خطرے میں رہتا ہے اور اسی میں انسان کی آزمائش ہے کہ خدا کے حکم کو آگے رکھتا ہے اس فطری کمزوری کے بہاؤ میں بہتا ہے؟ یہ مساوات مرد و عورت کا مغربی تصور، اللہ کی پناہ! یہ نہیں اس کو قبول کر لینے والے ہمارے لوگ یہ بات کیسے بھول جاتے ہیں کہ اس تصور کی دراز دستانیاں تو اس بارگاہ قدس تک پہنچنے سے ہی نہیں شرمانیں جہاں کے تصور ہی سے حضرت جبریلؑ کے پر جل اٹھیں۔ خواتین مغرب پوچھتی ہیں کہ اللہ (God) کے لئے مذکر ہی کی ضمیر کیوں استعمال کی جاتی ہے؟ یاد رہے کہ اردو کے برخلاف، عربی میں بھی اور انگریزی میں بھی مذکر، مونث کے لئے ضمیریں الگ الگ ہیں، ھو اور ھی He & She پس انہیں اس بات میں بھی عورت کی توہین محسوس ہوتی ہے کہ اللہ تبارک و تعالیٰ کا حوالہ مذکر کی ضمیروں سے دیا جائے اور ذرا بھی بعید نہیں رہا ہے کہ جس طرح اس تصور نے چیرمین کا لفظ متروک کرا کے چیر پرسن یا میڈیا میں ترک کرا کے میڈیا پرسن اس کی جگہ رائج کرا دیا، اسی طرح مغرب میں اللہ عز و جل کے حوالے کے لئے اس کا پتہ نہیں لگ سکتا۔

برابر ہیں جو چاہا استعمال کر لو۔۔۔ لیکن ان خواتین کا یہ دعوائے مساوات اس وقت یاد آ کے منی کی دعوت دینے لگتا ہے جب یہ مردوں کا جیسا لباس پہن کر مردوں کے جیسے سناٹل کے بھاری بھر کم بوت پہن کر ان کی جیسی وضع کے بال کنٹا کر زبان حال سے کہتی نظر آتی ہیں کہ واقعہ میں وہ اپنے آپ کو مرد کے مساوی نہیں پاتی ہیں۔ انہیں ان باتوں کی ضرورت بالکل اسی طرح ہوتی ہے جس طرح ایک کم رو کو غارہ پوڈر کے تکلفات کی۔

اچھا خیر وہ سورہ نساء کی آیت جس میں مردوں کے لئے قواہوت علی النساء کے الفاظ آئے ہیں کہ اس کی بات رہی جاتی ہے۔ سو یوں تو پوری آیت کے بغیر اس کا پہلا جملہ ہی بتا دیتا ہے کہ قواہوت کے لفظ سے شوہر کو بیوی کے مقابلے میں ایک درجہ بالاتری عطا فرمائی جا رہی ہے اور یہ وہی چیز ہے جس کو سورہ بقرہ کی آیت ۲۲۸ میں یہ کہہ کر کہ ”عورتوں کے بھی اسی طرح مردوں پر کچھ حقوق ہیں جیسے کچھ حقوق ان پر مردوں کے ہیں“ فرمایا گیا: ”وَلِلرِّجَالِ عَلَيْهَا دَرَجَةٌ“ ”پر مردوں کا ان کے مقابلے میں کچھ درجہ بڑھا ہوا ہے۔“ لیکن جس کسی پر یہ بات اس پہلے جملے سے واضح نہ ہو سکتی ہو اس کے لئے آیت کی آخری الفاظ بہر حال کافی ہو جائیں گے بشرطیکہ وہ ان سے آگے نہ بچانے کی کوشش نہ کرے اور یہ الفاظ یہاں سے شروع ہوتے ہیں:

فَالصَّالِحَاتُ قَنَاطَاتٌ حَافِظَاتٌ لِّلْغَيْبِ بِمَا حَفِظَ اللّٰهُ ...

ان میں نیک اور صالح عیبوں کی یہ صفت بیان کر کے کہ وہ فرمانبردار و فادار ہوتی ہیں۔ آگے سرکشی کرنے والیوں کے لئے بدرجہ آخر کچھ ضرب و تادیب تک کی اجازت صریح الفاظ میں دی گئی ہے۔ مغربی خواتین ضرور اس اجازت پہ ناک بھوں چڑھائیں گی۔ لیکن ان کے یہاں موجود نظریہ ”مساوات کی تمام تر پختگی بلکہ حکمرانی کے بار جو یہ ناقابل انکار واقعہ ہے کہ یہ خواتین اپنے شوہروں کے ہاتھوں بہر حال بنتی ہیں۔ (جس کی شہادت ان محترم خاتون کی زبان سے بھی جن کے حوالے سے یہ گفتگو چل رہی ہے مذکور بالا ذکرہ میں بایں الفاظ پائی جاتی ہے:

”بیویوں کو پیٹا جاتا ہے اگرچہ عورتوں کو پیٹنا ان کے روزمرہ معمولات میں شامل نہیں ہے، لیکن جب پیٹتے ہیں تو بہت بری طرح پیٹتے ہیں۔“

پس قرآن پاک جو اس کی اجازت دیتا ہے جبکہ پیغمبر ﷺ کا رویہ اس کی ہمت تلخی کا تھا تو اس سے جہاں ایک طرف اس اجازت کا مطلب یہ سمجھنا ضروری ہو گا کہ یہ بدرجہ مجبوری کی بات ہے وہیں یہ سمجھنا بھی چاہیہ کہ یہ عورت و مرد کے رشتہ کا ایسا معاملہ ہے جس کے لئے گنجائش رکھنا ہی پڑے گی۔ اے اللہ ہمیں حق دکھا اور اس کی پیروی کا حوصلہ دے۔